(غلام گردش)

پرانا پاکستان

سوشل میڈیا پر صرف چالیس سے پچاس برس پہلے سبی شہر کی ایک تصویر لگائی گئی ہے۔ بتا تا چلوں سبی، بلوچستان میں ہے اور ملک کے گرم ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شہر کی پہچان ہی یہ ہے کہ موسم گرما میں قیامت خیز گرمی برداشت کرنے والا علاقہ ہے۔ مگر اس شائع شدہ تصویر میں موسم کی حدت اور شدت کے متعلق کچھ بھی نہیں ہے۔ دراصل یہ تین مغربی خواتین کی نایاب تصویر ہے۔ جس میں وہ بطور سیاح بلوچستان آئی ہوئی ہیں۔ سبی چوک میں رکی ہیں اور انتہائی اطمینان سے چوک میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ انکی عمریں قیافہ کے لحاظ سے بیس اور تیس برس کے درمیان ہونگی۔ انتہائی اہم بات یہ بھی ہے کہ انکے چہروں پر مسکراہٹ ہے۔ کسی قسم کا کوئی خوف کا نام ونشان نہیں۔ تمام نے مغربی لباس زیب تن کر رکھا ہے۔ یہ اوائل عمری کا پاکستان تھا۔ جس کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد تک ہمارا ملک دنیا کے ہر ملک کے سیاحوں کیلئے جنت کا درجہ رکھتا تھا۔ جرائم سے تقریباً پاک ایک ایسا خطہ، جہاں عام لوگ مغربی دنیا سے آنے والے لوگوں کا دل کھول کر خیر مقدم کرتے تھے۔ انہیں حفاظت اور عزت کا احساس دلاتے تھے۔ انکی تکریم میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے تھے۔ ہمارا علاقہ ترقی یافتہ ملکوں کی طرح تھا۔ مذہبی شدت پسندی اور کسی قسم کی انتہا پسندی سے پاک۔ گورے گاڑیوں اور سائیکلوں تک پر ہر علاقے میں گھومتے رہتے تھے۔ یہ منظر ہر شہر میں ہر وقت دیکھنے کو ملتا تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ اس جنت نظیر ملک کو کیسے دھکے مار مار کر دہشت گردی کے جہنم میں بدل دیا گیا۔ پچاس برس پہلے کا کراچی کیا تھا۔ اس پر بات کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ دکھ نہیں، شدید غم۔ اس شہر میں ہر جگہ سے سیاح دیوانوں کی طرح ہر پل آتے رہتے تھے۔ مسلمان دنیا میں اس شہر کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ بلند و بالا عمارتیں، چوڑی سڑکیں، بھرپور سمندر اور زندگی کے تمام لوازمات۔ ایک سے بڑھ کر ایک بڑھیا ہوٹل اور ہر بڑے ہوٹل میں طلسم ہوشربا جیسی زندگی۔ یہ نہیں کہ غربت نہیں تھی۔ مگر آج کی بھیانک فاقہ کشی قطعاً قطعاً نہیں تھی۔ کراچی ایئر پورٹ دنیا کی ہر بین الاقوامی فضائی کمپنی کا مرکز تھا۔ ایسی ایسی کمپنیوں کے جہاز ایئر پورٹ موجود ہوتے تھے، جسکا نام بھی اب بھول چکے ہیں۔ جیسے برٹش ایئر ریز، لفتھینسا، ایئر فرانس اور اسی سطح کے اَن گنت فضائی بیڑے۔ ہر فضائی کمپنی کراچی میں ہوائی جہازوں میں تیل بھرواتی تھیں۔ پاکستان کو کس قدر غیر ملکی سرمایہ بغیر کسی تردد کے مل جاتا تھا، شائد اب تو خواب ہی لگتا ہے۔ یا شائد جھوٹ۔ اس کراچی کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، اس پر سالوں بحث ہو سکتی ہے۔ کیا آپ یقین کرینگے کہ اس شہر میں پانچ سو سینما ہال تھے۔ چالیس سے اوپر نائٹ کلب، لاتعداد پب اور دنیا کے سب سے دیدہ زیب سمندری ساحل تھے۔ عجیب سا نکتہ یہ بھی ہے کہ ایک مذہبی جماعت کے پیروکاروں نے 1977 کے بعد کراچی میں "حلق تر کرنے والی دکانوں" پر بے دریغ حملے کیے۔ یہ حملے کسی مذہبی لگاؤ کی بدولت نہیں تھے۔ بلکہ یہ لوگ بڑے اطمینان سے ان دکانوں پر پڑی غیر اسلامی چیزوں کو ذاتی استعمال کیلئے لوٹتے رہے۔ خیر ہر معاشرے میں شدت پسندوں کا عملی رویہ ایک جیسا ہے۔

پنجاب کی طرف آیئے۔ لاہور حقیقی طور پر مغربی سیاحوں سے اَٹا ہوا خطہ تھا۔ مال روڈ پر ایک درمیانے درجہ کا ہوٹل تھا۔ انٹرنیشنل

ہوٹل۔اسکے باہر درجنوں غیرملکی بسیں کھڑی ہوتی تھیں۔مختلف رنگ اور جسامت کی یہ بسیں اس وقت کم ازکم ہمارے ملک میں ناپید تھیں۔دراصل یہ غیرملکی سیاحوں کیلئے بنائی گئیں تھی۔سفید فام اشخاص ایران،افغانستان،پاکستان اور دیگر ممالک میں بسوں پر سفر کرتے ہوئے کوئی مسئلہ محسوس نہیں کرتے تھے۔حیرت کی بات یہ بھی ہے،کہ مقامی عام بسوں میں بھی مغربی سیاح موجود ہوتے تھے۔صرف انٹرنیشنل ہوٹل میں ہر وقت،سینکڑوں لوگ موجود رہتے تھے۔آج مال روڈ پر انٹرنیشنل ہوٹل خاموش اور تاریک کھڑا ہوا ہے۔کسی اداس اور غم زدہ مسافر کی طرح۔درمیانے درجے کے اس ہوٹل کو بند ہوئے دہائیاں بیت چکی ہیں۔صدیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔کیونکہ بہرحال ذکر تو پچھلی صدی کا ہی ہے۔مال روڈ پر ہر موڑ پر سیاح ہی سیاح نظر آتے تھے۔مال روڈ پر ہی انٹر کانٹینٹل ہوٹل تھا۔اسکے ساتھ ایک خوبصورت گالف کورس بھی تھا۔یہ بہت نایاب اور خوبصورت ہوٹل تھا۔گالف کورس تو کب کا ختم ہوگیا۔اس ہوٹل میں بھی مقامی اور غیرملکی لوگ کثرت سے موجود رہتے تھے۔بغیر کسی خوف اور منافقت کے۔آواری کی جگہ ایک اور ہوٹل تھا۔مال روڈ پر ہی انڈس ہوٹل بھی تھا جو غیرملکی اوسط درجے کے لوگوں کیلئے مخصوص تھا۔خصوصی بات اسکے میوزک رومز تھے۔دنیا بھر کا میوزک ہوٹل کی انتظامیہ نے بڑی محنت سے جمع کر رکھا تھا۔گلبرگ میں مغل ہوٹل اور مین مارکیٹ میں زنوبی ہوٹل انتہائی زندہ دل ماحول کی آماجگاہ تھے۔قصہ کوتاہ یہ کہ لاہور کے چپہ چپہ پر سیاحوں کا ہجوم تھا۔اپنی دنیا میں مگن مغربی مرد اور خواتین ہر طرف نظر آتے تھے۔کیا آج کی نسل اس پرانے لاہور کو چشم تصور میں بھی دیکھ سکتی ہے۔جواب مکمل نفی میں ہے۔ہاں،آج کے اس مبینہ پاکیزہ شہر میں،چھپ کر ہر دھندا ہو رہا ہے۔کوئی اسے روک نہیں سکتا۔کیونکہ انسانی فطرت کو قطعاً تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔جبلت میں جو چیز موجود ہے،وہ دراصل آفاقی ہے۔کسی بھی مذہبی،سماجی اور معاشرتی قید سے آزاد۔

بڑے شہروں میں سیاحوں کی آؤ بھگت اور آزاد ماحول کو رہنے دیجئے۔ہماری ریل گاڑیوں میں اَن گنت مغربی لوگ سفر کرتے تھے۔بڑی ٹرینوں کی بات نہیں کر رہا۔ایک پسنجر ٹرین پر تاندلیانوالہ سے لاہور آرہا تھا۔حیرت ہوئی جب کہ اس اجنبی راستوں والی ریل گاڑی پر گورے نظر آئے۔یہ بڑے آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔کئی سٹیشنوں پر رک کر جلدی جلدی قلفیاں خریدتے تھے اور مزے سے نشست پر بیٹھ کر لطف اندوز ہوتے نظر آرہے تھے۔یہی حال گوری خواتین کا تھا۔کسی نے بھی کرتا شلوار نہیں پہن رکھا تھا۔اپنے ملکی لباس یعنی ڈھیلی ڈھالی سکرٹ میں ملبوس۔ان خواتین کو کوئی بھی پاکستانی گھور نہیں رہا تھا۔اب تو خیر ایسے لگتا ہے کہ پاکستانی مردوں کی نگاہ میں کوئی ایسا مسئلہ ہے کہ کہ مغربی کیا،مقامی خواتین پر بھی ٹکٹکی بندھی ہوتی ہے۔یہ سماجی رویے ہماری دوعملی کا زندہ ثبوت ہیں اور ایک روندے ہوئے معاشرے کی عملی مثال۔باقی سب باتیں ہیں۔

ہاں،ایک اور دلچسپ بات۔انڈیا سے ہر برس سینکڑوں سکھ مذہبی رسومات پوری کرنے کیلئے پاکستان آتے تھے۔رنگ برنگی پگڑیاں پہنے ہوئے مرد،ہمیشہ ہمارے ملک سے پلاسٹک کے واٹر کولر ضرور خریدتے تھے۔ہاتھ میں شوخ رنگوں کے واٹر کولر تھامے ہوئے سکھ مرد اور خواتین عام نظر آتے تھے۔اکثر اوقات دیکھنے میں آیا کہ کوئی طالبعلم موٹر سائیکل پر انکے قریب رکتا تھا۔موٹر سائیکل پر بٹھا کر منزل تک باآسانی چھوڑ آتا تھا۔یہ رویہ تو بڑی دیر جاری رہا۔ہال روڈ لاہور میں کے ای میڈیکل کالج کے طلباء اکثر اپنی موٹر سائیکل

پر غیر ملکی سیاحوں بشمول سکھوں کو عام سیر سپاٹا کرواتے رہتے تھے۔کوئی تنقید نہیں کرتا تھا۔سکھ اپنے متعلق مشکل لطیفے سنکر کر قہقہے لگاتے تھے۔جواب میں مسلمانوں کے مشکل ترین لطیفے سنایا کرتے تھے۔حکومتی سطح پر جس طرح کے بھی تعلقات ہوں،لوگوں میں ایک دوسرے کیلئے اپنائیت کا جذبہ نظر آتا تھا۔

آج کے کراچی اور لاہور میں غیر ملکی سیاح مکمل طور پر ناپید ہیں۔کوئی کسی کام سے آتا ہے تو مجبوراً آتا ہے۔ہوٹل سے باہر نہیں نکلتا۔ڈرا اور سہما سا رہتا ہے۔جلد از جلد کام ختم کر کے یہاں سے بھاگنے بلکہ فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے ۔خیر زمانہ تبدیل ہو چکا ہے۔پاکستان تو خیر مکمل طور پر ہی عجیب سے طریقے سے بدل چکا ہے۔اب یہاں مقامی سیاحت ہے۔تفریح سے محروم لوگ ہزاروں نہیں،لاکھوں کی تعداد میں شمالی علاقوں میں جاتے ہیں۔وہاں درمیانے درجہ کے ہوٹل اور ریستوران مقامی سیاحوں کی چمڑی ادھیڑ لیتے ہیں۔کسی بھی ہوٹل کا کرایہ اتنا مناسب نہیں کہ عام لوگ آرام اور سکون سے وہاں ٹھہر سکیں۔ادنیٰ ترین کمرے سات سے بارہ ہزار تک ملتے ہیں۔غلاظت،گندگی ،بدتمیزی اور بدتہذیبی الگ دیکھنے کو ملتی ہے۔پرانے پاکستان میں کوئی موٹروے نہیں تھا۔کوئی بہترین سڑکیں نہیں تھیں۔کوئی تکلیف دہ پابندی نہیں تھی۔نتیجہ سامنے تھا کہ غیر ملکی اور ملکی سیاح ہر طرف کیڑوں کی طرح بکھرے ہوتے تھے۔خوشی اور سکون سے چند دن گزار کر پھر اپنے اپنے ملکوں اور شہروں کی طرف رواں دواں ہو جاتے تھے۔بغیر کسی کو تکلیف یا آزار پہنچائے بغیر۔ملک اپنے ماحول کی بدولت بھرپور ترقی کر رہا تھا۔ترقی یافتہ معاشرے کی تمام خصوصیات پاکستان میں موجود تھیں۔

اب پاکستان ایک مختلف سا ملک بن چکا ہے۔سارا دن بتایا جاتا ہے کہ ملکی سطح پر کسی تنہائی کا شکار نہیں۔بے جان قسم کے میلے اور فنکشن کروا کر ثابت کرتے ہیں کہ دنیا کے دیگر ممالک کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔پر ہمیں بھی معلوم ہے اور دنیا کو بھی پتہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اب اکثریتی طور پر شدت پسندی کے مہلک مرض میں مبتلا ہے۔ہمارے چند حلقے یقین دلا چکے ہیں کہ دنیا کی کوئی اہمیت نہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک بے جان سے معاشرے میں تبدیل ہو چکے ہیں۔جہاں لفظوں اور عملی زندگی میں ہزاروں نوری سالوں کا فرق ہے۔تین ممالک یعنی چین،سعودی عرب اور ترکی اپنے اپنے مفاد کی خاطر ہمیں کچھ کچھ گھاس ڈالتے ہیں۔کوئی یہ بات کرنے کو تیار نہیں کہ ہم بین الاقوامی سطح پر تنہا نہیں بلکہ مکمل طور پر تنہائی کا شکار ہیں۔جھوٹ کے سہارے ہم اپنی ساکھ اور قدر کو کیسے بہتر کر پائینگے۔کسی کے پاس اس اہم ترین سوال کا تسلی بخش جواب نہیں۔دراصل ہمیں نئے پاکستان کی نہیں بلکہ پرانے پاکستان کی ضرورت ہے۔

راؤ منظر حیات